مسدسِ حالی

صدی ایڈیشن

مرتبہ

ڈاکٹر سید عابد حسین

ایم۔ اے، پی ایچ ڈی

first, Indian ed : 1935

second, Pakistani ed : 1957

ناشر

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

پہلا دیباچہ

سنہ ۱۲۹۶ھ
۱۸۷۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوٹی　　بزم شعرا میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے، ایک ایسے دلچسپ اور پُرفضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے، نہ خاردار جھاڑیاں تھیں، نہ آندھیوں کے طوفان تھے، نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان میں کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہوگئیں۔ مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا۔ اس کی سرسبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اُس کے خوشنما پودوں پر سانپ اور

بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جونہی اُس کی حد میں قدم رکھا، ہر گوشے سے شیر و پلنگ، مار و کژدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابلِ دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذّت اُٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالہ نیم شبی سے رُبعِ مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کرّ و بیان کے کان بہرے ہو گئے۔ شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اُٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب بے شک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے۔ جب شوق کا دریا اُمڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر ہوا۔ بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو خُم کے خم لنڈھا دیے اور پھر سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمّار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی اور کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بیزار رہے، پیرِ مغاں

کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بُت پوجے، زنّار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کہیں، واعظوں کا خاکہ اُڑایا، دیر اور بتخانے کی تعظیم کی، کعبے اور مسجد کی توہین کی، خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجازِ مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہیدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے مُنہ بھر دیے۔ ہر مشتِ خاک میں اکسیرِ اعظم کے خواص بتلائے، ہر چوب خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھائے، ہر نمرود وقت کو ابراہیمؑ خلیل سے جا ملایا، ہر فرعون بے سامان کو قادرِ مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مدّاح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی ؎

چو پرسش گنہم روزِ حشر خواہد بود تمسکاتِ گناہان خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اُسی ایک چکّر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں ؎

شکستِ رنگِ شباب و ہنوز زعفرانی دراں دیار کہ زادی ہنوز آں جائی

نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں، آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا

قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں۔ مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو اُن سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمّی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک[1] خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے، ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں، مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں، دم چڑھ رہا ہے، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے، نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اُس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اُسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے۔ نہ یہ خبر ہے کہ کہاں جاتے ہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں، نہ طلب

[1] یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں (غفرلہٗ) ۱۳۱۵ ہجری۔

صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے، نہ عزم ہے، نہ استقلال ہے، نہ صدق ہے نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں — دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھارنے سے دل بڑھتا تھا، نہ ساتھیوں کی ریس ہی کچھ جوش آتا تھا۔ مگر یہ ایک ایسے ناسور کا مُنھ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخارات درونی جن کے رُکنے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے۔ قوم کے ایک سچّے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پُر زور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمّے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔

رو چو انساں لب بجنباں در دہن — ور جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں، تعصّب کی گھنگھور گھٹا تمام

قوم پر چھائی ہوئی ہی۔ رسم کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہی۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہی۔ امرا، جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پروا ہیں۔ علما، جن کو قوم کی صلاح میں بہت بڑا دخل ہی، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہی۔ ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہی۔ ہرچند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں، مگر نظم، جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہی اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہی، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہی کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا۔ مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں، ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔

درفیض است منشیں از کشایش ناامید ایں جا ‏ ‏ ‏ ‏ برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ[1] ہرچند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا، ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی، دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں

[1] اور وہ ایسا خدا ہی کہ جب لوگ ناامید ہو جاتے ہیں تو وہ مینھ برساتا ہی اور اپنی رحمت پھیلاتا ہی۔

ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انہی سے کام لینا شروع کیا، اور ایک مسدّس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کی مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا، مگر ہر حال میں یہ دھن لگی رہی۔ بارے الحمدللہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہو گئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک امید کے سہارے پر یہ راہ دُور دراز طے کی گئی ہی۔ ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہی اور نہ آیندہ ملنے کی توقع ہی۔

خرم نیست کہ منزل گہِ مقصود کجاست ‏ ‏ ‏ ‏ ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اس مسدّس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہی جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا، اور نبیِ اُمّی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعۃً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اُس ابر رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا، اور مسلمانوں کا دینی اور دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہی۔ اس کے بعد اُن کے تنزّل کا حال لکھا ہی۔ اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہی، جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں

کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ اگرچہ اس جانکاہ نظم میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، مگر شکر ہے کہ جس قدر ہو گیا اتنی بھی امید نہ تھی۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہراً اس... روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات ہیں، یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے، یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اُس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگین بیانی ہے۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ[1]۔ گویا اہل دہلی اور لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چُنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی ہے، بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو اُن کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس ‏ ‏ ‏ ‏ در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

---

[1] نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی بشر کے دل میں گزرا۔

دوسرا دیباچہ

سنہ ۱۳۰۳ھ — ۱۸۸۶ع

حدیث درد دلا ویز داستانے ہست ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

مسدس مدوجزر اسلام اوّل ہی اوّل سنہ ۱۲۹۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتدبہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا، مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت یا شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے۔ نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے۔ قوم کی خرابیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سنان کا کام لیا گیا تھا۔ ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار و اخیار مذہبی سوء ظن رکھتے تھے۔ تعصب عموماً کلمۂ حق سننے سے مانع تھا۔ با ایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے چھپ چکے ہیں۔ بعض قومی مدرسوں میں اُس کا انتخاب بچّوں کو پڑھایا جاتا ہے۔

مولود شریف کی مجلسوں میں جا بجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو
پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی
زبان پر جاری ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اُس کے مضامین ایکٹ کئے جاتے ہیں۔
بہت سے مسدّس اُسی کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ شمالی مغربی اضلاع
کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کر لیا گیا ہے۔ یہ اور
اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نے اس کی طرف
کافی توجہ کی ہے۔ مگر اس پر مصنّف کو کچھ فخر کرنے کا محل نہیں ہے۔ اگر قوم کے دل میں متاثر
ہونے کا مادّہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ایسی ہزار نظمیں بے کار تھیں۔ پس مصنّف کو اگر فخر ہے تو
صرف اس بات پر ہے کہ اُس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی
نہیں چاہی۔ اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں
ہے۔ وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں۔
اُن کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں، مگر قابلیت موجود ہے۔ اُن کی صورت بدل گئی ہے مگر
ہیولیٰ باقی ہے۔ ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں مگر زائل نہیں ہوئے۔ ان کے جوہر مٹ
گئے ہیں مگر جلا سے پھر نمودار ہو سکتے ہیں۔ اُن کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں، مگر
چھپی ہوئی۔ اُن کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔
یہ نظم جس میں قوم کی گذشتہ اور موجودہ حالت کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا مدنظر تھا

اگرچہ مشرق کی عام نظموں کی نسبت مبالغے سے خالی تھی، لیکن فروگزاشت سے خالی
نہ تھی۔ دوست کی نگاہ نکتہ چینی اور خردہ گیری میں وہی کام کرتی ہے جو دشمن کی نگاہ
کرتی ہے۔ دونوں یکساں عیبوں پر خردہ گیری اور خوبیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں مگر
دشمن اس غرض سے کہ عیب ظاہر ہوں اور خوبیاں مخفی رہیں، اور دوست اس خوف
سے کہ مبادا خوبیوں کا غرور عیبوں کی اصلاح سے باز رکھے۔ مصنّف بھی جو کہ دوستی کا
دم بھرتا ہے شاید محبت اور دل سوزی ہی سے قوم کی عیب جوئی پر مجبور ہوا اور ہنرگستری
سے معذور رہا۔ مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا
بھی تھا۔ مصنّف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ
میں سرایت کر گئی تھی۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں
منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں۔ شاید اس خرابی کا تدارک
کچھ نہ ہو سکتا اگر قوم کی توجہ مصنّف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی اور قوم
کو ایک نئے خطاب کا مستحق نہ ٹھہراتی۔ گو قوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے
جاتے ہیں۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفریں ضرور کم ہونی چاہیے۔ بعض احباب
کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل
مسدّس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔ ضمیمہ کو طول دینا مصنّف کا مقصود نہ تھا مگر اس
مضمون کو چھیڑ کر طول سے بچنا ایسا ہی مشکل تھا جیسے سمندر میں کود کر ہاتھ پاؤں نہ مارنا